تھا، مگر اُس وقت اُس میں سپاہی لال خاں سے ردّ و قدح کرنے کی ہمّت نہ تھی۔ آخری گھونٹ پر اُسے گہری اُبکائی آئی۔ لال خاں باہر جانے لگا تو اسد نے ٹین کے برتن کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ خالی نہیں ہو سکتا؟"

"پہلے اِسے بھر بھر خالی بھی کر لینا۔ تیرے باپ کا ہوٹل ہے؟" سپاہی نے کہا۔

رات بھر تکیے کا پتھر اُس کی گردن کو کاٹتا اور پیشاب کی بُو اُس کے دماغ کو چڑھتی رہی۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کی پسلیاں درد کر رہی تھیں۔ روشن دان کی سلاخوں کے پیچھے آسمان کا ٹکڑا چمک رہا تھا۔ نیم خواب کی حالت سے ہی اُس کے دماغ کی سطح پر ایک سوال گشت کر رہا تھا: یہاں سے کیسے نکلوں؟

★ ★ ★ ★ ★

سہ پہر کے وقت ایک دُوسرا سپاہی، جو نسبتاً شریف طبع تھا، کوٹھڑی کا تالا کھول کر اندر داخل ہُوا۔ اُس نے اسد کو چھوئے بغیر ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ تھانیدار دفتر کی کُرسی پر یوں نیم دراز تھا جیسے آرام کُرسی پہ بیٹھا ہو۔ اس وقت اُس کے دفتر میں ایک دُوسرا آدمی بھی موجود تھا جو میز کے دہنے ہاتھ کُرسی پر بیٹھا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس اس شخص کا چہرہ اسد کو مانوس معلوم ہوا، مگر اُس وقت اُسے یاد نہ آیا کہ کہاں دیکھا ہوا ہے۔ سپاہی لال خاں ہاتھ پیچھے باندھے ایک طرف کھڑا تھا۔ تھانیدار اُس نووارد سے کسی انجانے موضوع پر بات کرنے میں مصروف تھا۔ اسد کھڑا انتظار کرتا رہا۔ بات کرتے کرتے تھانیدار نے دو ایک بار بے خیالی کے انداز میں غور سے اسد کو دیکھا۔ چند منٹ کے بعد وہ بات ختم کر کے اسد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ بولا۔

اسد وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اُسے اپنے کانوں پہ اعتبار نہ آ رہا تھا۔ تھانیدار نے بے صبری سے آنکھیں میچ کر، جھکے ہُوئے انداز میں ہاتھ سے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسد آگے بڑھ کر میز کے پاس پڑے ایک سٹول پر بیٹھ گیا۔

"اسے پہچانتے ہو کیا ہے؟" تھانیدار نے فرش کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا۔

میز کے پاس زمین پر بندوق کا ڈبا رکھا تھا۔

"ہاں۔"

"کیا ہے؟"

"حکیم کی بندوق۔"

"تو تمہارے علم میں تھا کہ اُس کے پاس بندوق ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا تمہارے علم میں تھا کہ اس کا لائسنس دس سال ہوئے ختم ہو چکا ہے؟"

اسد نے انکار میں سر ہلایا۔

"اور دس سال سے بڈھا"، تھانیدار دوسرے آدمی کی طرف دیکھ کر بولا، "اسے غیر قانونی طور پر چوڑیوں میں لیے بیٹھا ہوا ہے۔"

وہ آدمی آہستہ سے مسکرایا۔

"اگر میرے ہاتھ آجاتا،" تھانیدار بولا، "تو سات سال بامشقت دلواتا، حکیمی ساری نکل جاتی۔ اس کی قسمت اچھی تھی ــــ"

"جو مر گیا۔" دوسرے شخص نے کہا، جس پر تھانیدار نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ دونوں سپاہی بھی ہنسنے لگے۔ کچھ دیر تک اس مذاق پہ محظوظ ہونے کے بعد تھانیدار پھر اسد کی طرف متوجہ ہوا۔

"قتل کی رات والے دن، یعنی پیر کو، ظہر کے وقت تمہارے اور مقتول کے مابین اس کے،" اس نے بندوق کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا، "بارے میں کیا بات ہوئی تھی؟"

"یاسمین اپنے باپ سے بضد تھی کہ بندوق گاؤں والوں کے حوالے کر دی جائے۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا کہ لڑکی کس بات پر بضد تھی۔ تمہاری،" تھانیدار نے اپنی انگلی اسد کے سینے پر رکھی، "کیا بات ہوئی؟"

"میں نے کہا تھا کہ بندوق گاؤں کے لوگوں کو نہیں دینی چاہیے۔"

"کیوں؟"

"میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔"

"اوہو۔ تو تمہارے خیال میں اس کا کیا نقصان ہوتا؟"

"یہ بندوق شیر کے شکار کے لیے موزوں نہیں۔" اسد نے کہا۔ "خواہ مخواہ اُسے زخمی کر کے خطرہ

مول لینے والی بات تھی۔"

"اچھا آ ــــ ہ" تھانیدار نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا، "تو تم شیر کے شکار کے بھی ماہر ہو؟"

"یہ بندوق پرندوں اور چھوٹے موٹے جانوروں کے شکار کے لیے ہے۔" اسد نے کہا، "میرے والد کے پاس ایسی بندوق تھی۔"

"اپنے مؤقف کی حمایت میں تم نے مقتول پر دباؤ ڈالا تھا؟"

"نہیں۔ میں نے صرف اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔"

"پھر مقتول نے کیا وطیرہ اختیار کیا؟ اُس نے تمہاری بات مانی یا اپنی بیٹی کی۔"

"مجھے علم نہیں۔ میں وہاں سے چلا آیا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے اُس نے بندوق گاؤں والوں کو دے دی؟"

"ظاہر ہے کہ نہیں دی۔"

"ظاہر کیسے ہے؟"

"بندوق آپ ــــ جولے آئے ہیں۔"

"تو گویا میں گاؤں والوں سے برآمد نہیں کر سکتا؟"

اسد لاجواب ہو کر اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ پھر کمزور سی آواز میں بولا: "کر سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے علم میں تھا کہ بندوق گھر میں موجود ہے۔"

"ہاں۔" اسد آہستہ سے بولا۔

"یعنی تم نے دیکھی تھی۔"

"ہاں۔"

"کب؟"

"اُسی روز۔"

"کب؟" تھانیدار ایک دم اپنا مُنہ اسد کے قریب لا کر چیخا، "کب؟ کس وقت؟ میرے ساتھ جھوٹ بولتا ہے۔" اُس نے چیخ کر اپنی اُنگلی اسد کی آنکھوں کے آگے لہرائی، "یاد رکھو میں اُس کا وہ حشر کرتا ہوں کہ سات پُشتیں یاد رکھتی ہیں۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" اسد نے کہا۔

"تو بولو۔ کس وقت دیکھی؟ قتل سے پہلے یا بعد میں؟"

"بعد میں۔"

"قتل کرنے کے بعد دیکھی؟"

"اُس کی موت کے بعد دیکھی۔" اسد چیخ اُٹھا۔

"کہاں پر تھی؟"

"اُس کی چارپائی کے نیچے۔"

"چارپائی کے نیچے صرف یہ رکھی تھی یا کچھ اور بھی تھا؟"

"ایک صندوق بھی تھا۔"

"اور بندوق کس جگہ پڑی تھی؟"

"صندوق کے پیچھے۔"

"تو گویا تم نے اُس کی موت کے فوراً بعد اُس کے کمرے کی تلاشی لی؟"

"نہیں۔"

"صرف بندوق دیکھی؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

اسد اپنی آنکھوں سے ایک اِنچ کے فاصلے پر اُس کی اُبلتی ہوئی سُرخ آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

"کیوں؟" تھانیدار میز پر مُکّا مار کر گرجا۔ "کیا وجہ تھی کہ قتل کے کہرام کے بعد، اور ایک بپھری ہوئی لڑکی پر قابو پانے کے بعد تمہیں ایک اور صرف ایک چیز کا خیال رہا؟ تمہیں کسی اور چیز کا خیال نہ آیا سوائے اس کے کہ بستر کے نیچے گھُس کر صندوق کے پیچھے چھُپی ہوئی بندوق کو دیکھو کہ موجود ہے یا نہیں۔ کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ کیا مقصد تھا تمہارا؟"

"میں نے اُس وقت اپنے آپ کو خطرے کی حالت میں محسوس کیا تھا۔" اسد نے کہا۔

"پھر بندوق جڑی ہوئی کیوں نہ تھی، تمہارے ہاتھ میں کیوں نہ تھی، بند کیوں پڑی رہی؟ تمہارا خیال تھا اپنے آپ نیچے سے ٹھُس کرے گی؟"

پورے ایک منٹ تک وہ اُسی طرح جُھکا غصّے سے جلتی ہرنی آنکھیں اسد کے چہرے پر جمائے رہا پھر بہت آہستہ آہستہ ——— گویا کئی مرحلوں میں ——— کرسی پر بیٹھنے لگا۔ بیٹھ کر اُس نے ایک ہاتھ سے کلّے کے اُوپر کے بال سنوارے اور اپنی سوالیہ نظروں سے باری باری دونوں سپاہیوں اور میرے آدمی کو دیکھا پھر اسد کی طرف مُڑا۔ جب وہ بولا تو گرجتی ہوئی آواز اور چمکتا ہُوا لہجہ دب چکا تھا۔

"یہ دیکھ رہے ہو؟" اُس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی فائل کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا۔ اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مقتول کی بیٹی کا بیان ہے؟" تھانیدار بولا، "اُس نے تمہارے جُرم کی نشان دہی کی ہے۔"

اسد کا مُنہ کُھل گیا۔ "کیسے؟"

تھانیدار نے فائل اپنے سامنے کھینچ کر کھولی اور پڑھنا شروع کیا:

"مسمّی اسد کریم عرصہ گزشتہ ساڑھے آٹھ ماہ یا اِس سے کچھ زیادہ سے میرے مرحوم باپ (حکیم محمد گمشدہ والے) کے زیرِ علاج سانس کی بیماری کی وجہ سے ہے۔ اوّل عرصہ پانچ ماہ کے قریب اس طرح گزارنے کے بعد مسمّی ہذا گمشدہ چھوڑ کر بغیر اطلاع چلا گیا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد بوجہ بیماری بگڑ جانے کے (بقول اُس کے) واپس آ کر دوبارہ زیرِ علاج ہو گیا۔ میرے مرحوم باپ نے بوجہ مہربانی مسمّی اسد کریم مریض کو دواؤں کے گھولنے ملانے اور بناوٹ کے دُوسرے کاموں میں بطور مددگار کے حصّہ لینے اور گھر کے اندر آنے جانے کی اجازت دے دی۔ اُس وقت سے اسد کریم کے ساتھ میری جان پہچان شروع ہو گئی۔ مسمّی ہذا نے میرے مرحوم باپ سے طب کی تعلیم کے سلسلے میں اُسے اپنی شاگردی میں لے لینے کی درخواست بھی کی تھی۔ میری دانست میں ایسا کرنے سے اُس کا مقصد سانس کے عارضے کے بارے میں، جو کہ اُسے لاحق تھا، علم حاصل کرنا تھا۔ اسد کریم ایک پڑھا لکھا اور ہشیار آدمی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے مرحوم باپ سے وہ سانس کی دوا کا نُسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں، مگر اُس نے کچھ ہی مدت میں اپنی ذہانت اور ہشیاری کی بنا پر میرے باپ کے دل میں کچھ نہ کچھ جگہ پیدا کر لی۔ چنانچہ اپنے باپ کے کہنے پر میں بھی اسد کریم سے بات چیت کرنے لگی۔ میں مسمّی اسد کریم کو ایک دُکھی اور تنہا شخص گردان کر اُس کے ساتھ ہمدردی کرتی تھی اور بعض دفعہ اُس کی احمقانہ باتوں پر ہنسا کرتی تھی۔ مثلاً کئی مرتبہ اُس نے ذکر کیا تھا کہ وہ تنِ تنہا جنگل میں جا کر شیر کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ مسمّی اسد کریم شاعرانہ ذہنیت کا مالک ہے اور بعید از قیاس باتوں پر اکثر توجہ دیتا رہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ دنیاداری کی باتوں سے بھی ناآشنا نہیں رہتا۔ اُس نے ایک مرتبہ . . . . . ." اِس مقام پر تھانیدار پڑھتے

پڑھتے الفاظ کو منہ میں تیز تیز گنگنانے لگا، جیسے اِس حصّے کو اسد کی سماعت کے لیے خیر ضروری سمجھتا ہو۔ کچھ آگے جا کر اُس نے پھر سے عبارت کو صاف صاف پڑھنا شروع کر دیا: "بتاریخ دس مئی بروز پیر ظہر کی نماز سے ذرا پہلے اسد کریم اور میرے مرحوم باپ کے مابین بندوق کے لین دین کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ قبل ازیں اس کے مَیں اپنے باپ سے درخواست کر چکی تھی کہ گاؤں (گمشد) کے نمبرداروں کی خواہش کے مطابق بندوق اُن کو مستعار دے دی جاوے تاکہ اس کی مدد سے وہ خونی ورندے کا قلع قمع کر سکیں۔ اُدھر سے اسد کریم وہاں آن پہنچا۔ وہ دواؤں کے برتن لے کر گھر میں آیا تھا اور برتنوں کو ایک طرف رکھ کر وہ بن بلائے میرے والد کے کمرے میں آن کر داخل ہو گیا جہاں پر مَیں اپنے والد کے سر میں بادام روغن کی مالش کر رہی تھی، اور اسد کریم نے میری بات سُن لی اور اُس کی مخالفت کرنے لگا۔ اُس نے اپنا مؤقف واضح طور پر بیان نہ کیا بلکہ قرینِ قیاس وجہ سے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ بندوق گاؤں والوں کے حوالے کرنا مناسب نہیں۔ جس پر میرے والد نے اُس کی بات نہ مانی بلکہ خاموشی اختیار کر لی۔ سو اسد کریم بھی چُپ ہو رہا اور کچھ نہ بولا اور باہر چلا گیا۔ قیاس ہے کہ اِس بات کی وجہ سے اُس کو رنج ہوا۔ اُسی روز اسد کریم کے بے حد اصرار پر مَیں رات کے وقت اُس کے ہمراہ تھوڑی دُور تک ٹہلنے کے لیے چلی گئی اور جلد ہی واپس آ گئی۔ مَیں نے واپس آ کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہاں پہنچ کر پولیس افسر کی آواز پھر دھیمی ہو گئی۔ اُس نے ایک آدھ جُملہ تیز تیز زیرِ لب پڑھا اور رُک گیا۔ کھُلی ہُوئی فائل اُس نے اپنے آگے میز پر رکھ دی اور استفسارانہ نظروں سے اسد کو دیکھنے لگا۔ اسد جو برابر مُنہ کھولے، بے یقینی سے ایک ایک لفظ کو سُن رہا تھا بے اختیار بول اُٹھا:

"مَیں نہیں مانتا۔"

"کیا نہیں مانتے؟"

"کہ یہ اُس کا بیان ہے۔"

"یہ تمہاری ماں کے دستخط ہیں؟"

تھانیدار نے فائل اُسی طرح اُٹھا کر اسد کے سامنے میز پر کھڑی کر دی۔ اسد کا ذہن ایک لمحے کے لیے یکسر خالی ہو گیا۔ وہ ایسے اُس عبارت کو شروع سے پڑھنے لگا جیسے کسی نئی کتاب کو آرام سے کھول کر پڑھ رہا ہو۔

"مسمات یاسمین گل دختر حکیم محمد عُمر مرحوم قوم شیخ سکنہ گمشد بعمر پچیس سال قریباً نے دقوعہ ہذا کے متعلق جو کچھ حالات تحریر کرائے مذکورہ کا مفصل بیان زیرِ دفعہ ــــ ضابطہ فوجداری لیا جا کر لف رپورٹ

ضمنی نذاکیا جاتا ہے : بیان ازانِ مسمات ——"

تھانیدار کی جلتی ہوئی اُنگلی نے اسد کی پڑھائی کا سلسلہ توڑ دیا۔ بیان کافی طویل تھا، جو باریک شکستہ خط میں لکھے ہوئے دو بڑے صفحات پر مشتمل تھا۔ تھانیدار نے اُس میں سے صرف دو مختصر حصے پڑھ کر سُنائے تھے۔ دُوسرے صفحے کے دامن میں جس جگہ پہ تھانیدار اُنگلی رکھے تھا، بڑے حروف میں لکھا تھا : یاسمین گُل دختر حکیم محمد عُمر مرحوم۔

"یہ اُس کے دستخط نہیں۔" اسد نے کہا۔

"تم نے اُس کے دستخط دیکھے ہیں؟"

"اُس کا نام گُل یاسمین ہے۔"

"مَیں کہتا ہوں تُو نے اُس کے دستخط دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔" اسد نے رُک کر کہا۔

"تو یہ تیری ماں کے دستخط ہیں؟" تھانیدار چیخا، "کوئی بات اس میں غلط بیان کی گئی ہے؟"

"کوئی بات غلط نہیں۔" اسد نے کہا۔ "مگر جس طریقے سے بیان کی گئی ہے غلط ہے۔"

"اچھا آ —" تھانیدار بولا، "تو اور کس طریقے سے بیان ہونی چاہیے؟"

"یاسمین اس طرح کا بیان نہیں دے سکتی۔" اسد نے کہا، "مَیں اُسے جانتا ہوں۔"

"یہ تو اس وقت پتا چلے گا، بچہ، جب پھانسی چڑھو گے۔" تھانیدار نے کہا، "ابھی تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں آئے۔" اُس نے بازو کے ایک لمبے اشارے سے سپاہیوں کو حکم دیا، "بند کر دو اسے۔"

★ ★ ★ ★ ★

ہو سکتا ہے کاغذوں میں اُس کا نام یاسمین گُل ہی ہو، اسد نے سوچا، یعنی رجسٹر پیدائش میں یا سکول

میں داخلے کے وقت نام غلط لکھا دیا گیا ہو اور بعد میں ٹھیک کروانے کی بجائے ویسے ہی رہنے دیا گیا ہو؟ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کبھی نہ کبھی مجھ سے ذکر ضرور کرتی۔ مثلاً یہ کہ میرا اصل نام تو گل یاسمین ہے مگر کاغذوں میں ابا نے یاسمین گل لکھا دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ نام سے مگر کیا ہوتا ہے؟ بیان سرے سے جھوٹا ہے۔ یاسمین ایسی باتیں کر ہی نہیں سکتی۔

یا کر سکتی ہے؟

ایک بے معلوم سے نکتے کی تلاش میں اسد کا ذہن دور و نزدیک گھومنے لگا۔ اس نکتے کا شائبہ اُسے اُس وقت ہوا تھا جب تھانیدار لڑکی کا بیان پڑھ رہا تھا — مگر بہت مدھم، جیسے بہت دور سے کسی کی پشت کو دیکھ کر اُس کی پہچان کی جائے اور پھر وہ غائب ہو جائے۔ یہ ایک ایسا نکتہ تھا جو یاسمین سے منسوب اُس بیان کے جھوٹ کو ظاہر کرتا تھا، اور جواب ہزار کوشش اُس کی گرفت میں نہ آ رہا تھا، گو اس کی یادداشت بہت واضح طور پر اُس کے ذہن میں موجود تھی۔ ایک نکتہ ایسا ہے، وہ بار بار اپنے آپ سے کہتا، اتنا صاف مجھے یاد ہے کہ ہے۔ اب یاد نہیں آ رہا۔ یاسمین ایسا بیان نہیں دے سکتی۔

رات کو سپاہی کرم دین بھورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا۔ اسد کا معدہ خالی ہو چکا تھا، چنانچہ اُس نے روٹی کے چند ٹکڑے شوربے کے ساتھ کھائے اور باقی شوربہ گھونٹ گھونٹ کر کے پی گیا۔ اُس بے مزہ نیم گرم پانی نما شوربے سے اُس کا جی قطعاً بھر چکا تھا۔

"روٹی پاس رکھ لے" سپاہی نے جاتے جاتے کہا، "کسی وقت کھا لینا۔ کھائے گا نہیں تو طاقت زائل ہو جائے گی۔"

"شوربے میں نمک ذرا زیادہ ڈالا کرو۔" اسد نے آہستہ سے درخواست کی۔

بیٹھے رہنے سے پتھر کی ہموار سطح نوکدار کنکروں کی مانند اُس کی ہڈیوں کو چبھنے لگی۔ وہ اُٹھ کر اندھیری کوٹھری میں پھرنے لگا۔ چلتے چلتے کبھی وہ ایک دیوار سے کبھی دوسری سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ تھانے کی عمارت قدیم اور بھاری پتھروں سے تعمیر شدہ تھی۔ برآمدے میں ایک لالٹین لٹک رہی تھی اور پہریدار سپاہی کھاٹ پہ بیٹھا ایک بوسیدہ سی فاقدہ نما کتاب کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا، مگر رات پڑے اس جگہ پر سردی ہو جاتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسد کے پاؤں برف کی مانند یخ ہو جاتے، یہاں تک کہ چلنے پھرنے پر بھی گرم نہ ہوتے۔ پھر وہ پنجوں کے بل پتھریلے فرش پر اُچھلنا شروع کر دیتا، جیسے رسی ٹاپتے ہیں، حتیٰ کہ اُس کا دم پھول جاتا اور بھوک شدت سے لگنے لگتی۔ عجیب بات تھی کہ اس طرح دم پھولنے سے اُس کی سانس پہ کوئی

اُترنہ پڑتا۔ آج چوتھی رات تھی اور سانس ایسی ہموار چل رہی تھی جیسے تازہ تازہ مرمت شدہ مشین میں چلتی ہے۔ بھوک آہستہ آہستہ اپنے آپ ختم ہوجاتی۔ پھر ادھ بنے خیالات کا ایک سلسلہ چلتا۔ عجیب عجیب سوالوں کی گتھیاں آتیں اور روئی کے ریشوں کی طرح اُلجھی اُلجھائی، اُڑتی ہوئی گزر جاتیں۔ بیچ بیچ میں، گندم کی تندوری روٹی اور سالن کھانے کی طلب اُس کے ریشے ریشے میں بُری طرح پیدا ہوتی۔ ٹھنڈک ایک بار پھر پاؤں کے تلووں سے چڑھنی شروع ہوتی، جیسے موت ہو۔

اوڑھنے والے کمبل کو تہہ کر کے اسد نے اُسے پتھر پہ رکھا اور اُوپر بیٹھ گیا۔ اِس بے دید، بے صوت کوٹھڑی پہ اُسے ایک ایسے دربند مقبرے کا گمان ہوا جو مدت ہوئی کسی تلاطم میں آکر زیرِ زمین دفن ہوچکا ہو۔ یہ احساس کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، کہ اب وہ ایک قیدی ہے اور اُس کا کوئی پرسانِ حال نہیں، اُس کے دل کو شل کیے جا رہا تھا۔ کوئی سبیل، کوئی حل، کوئی چکمہ، کوئی آدمی، اُس نے سوچا، کوئی تو ہوگا۔ کیسے ممکن ہے کہ کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ ہر کسی کا کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلتا ہے۔ وگرنہ تو زندگی ختم ہوجائے۔

تو کیا زندگی ختم ہو رہی تھی؟ اُس نے حیرت سے سوچا۔ نہیں۔ یہ مان لینا اُس کے لیے انتہائی دشوار تھا کہ اُمید کی رمق بھی نہیں رہی۔ یہ بات اُسے بعید از قیاس ہی نہیں، نہایت احمقانہ لگتی کہ وہ ابھی زندہ ہو اور کوئی ایک راستہ بھی نہ رہے؟ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں ابھی زندہ ہوں، اس نے پیٹ میں بھوک کو محسوس کر کے سوچا، جان میری ابھی قائم ہے۔ پاؤں پر جرابوں کا ایک جوڑا ہو تو کچھ گرم رہیں۔ کمبل لپیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یا اللہ، میرے پیٹ میں کیسی قبض ہو رہی ہے۔ اس کوٹھڑی کی طرح۔ کوئی جنبش نہیں۔ آواز تک نہیں آتی۔ مجھے ایک ہلکے سے جلاب کی ضرورت ہے، ورنہ جان پیٹ میں دفن ہوجائے گی۔ دو روز سے پیشاب کا برتن خالی نہیں ہوا۔ اب کوئی آیا تو اُس کے سر پہ انڈیل دوں گا، دیکھا جائے گا۔ خدایا، کیسی سڑاند ہے۔ کیا کروں۔

مگر اس ابتری کے باوجود، اُس کے ذہن کی زیریں سطح حیرتناک طور پر صاف سے صاف تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گدلی اور متلاطم سطح کے نیچے شیشے کے اس مکعب کی خاموش اور مستحکم فضا میں نظر کی شعاع بڑی دُور تک بے روک ٹوک جاتی تھی۔ یہاں پر پہلے جو چند چہرے، یا کچھ آوازیں موجود تھیں، اب ایک ایک کر کے غائب ہو چکی تھیں۔ پُرانی باتوں میں ایک یاسمین کا چہرہ ابھی باقی تھا، مگر وہ بھی اب دھندلا چلا تھا۔ اِس کی بجائے اب اس جگہ کے اندر ایک بالکل نئی شبیہہ علین درمیان میں اُبھر رہی تھی۔ یہ شبیہہ پتھر پر بیٹھے ہوئے

ایک قیدی کی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے اور ہاتھ خالی تھے، اور وہ سر اٹھائے سامنے کو دیکھ رہا تھا۔ اس بے سُرسامانی کی کیفیت میں بھی اس شبیہہ کے اندر ایسا انداز تھا جیسے لوہے کے سُرخ پتھر کو کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ اس کے سر میں کوئی جنبش نہ تھی۔ کبھی کبھی اس بھاری مجسّمے کو اپنے دل میں نصب دیکھ کر اسد غور و پریشان ہو جاتا۔ مگر اس کو وہاں سے ہٹانا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ کیا میں اب ایک مُستقل قیدی کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہوں؟ ہمیشہ کے لیے؟ یاسمین کا چہرہ بھی دھندلاتا جا رہا ہے۔ یاسمین کسی صورت اس قسم کا بیان نہیں دے سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے۔ ایک عورت پر کیسا تشدد کیا جا سکتا ہے؟ نہیں۔ تشدد کی ضرورت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ بیان دیتی رہی اور اسے توڑ موڑ کر لکھا جاتا رہا۔ یا اُس سے صرف سوال جواب ہوئے اور بیان بعد میں لکھا گیا، یہیں تھانے میں یا کہیں اور۔ یہ تحریر اُس کے بیان پر مبنی تو ہے مگر اسے یہ شکل بعد میں دی گئی ہے۔ اس میں باتیں سب ٹھیک ٹھیک بتائی گئی ہیں سوائے آخری جملے کے۔ باہر وہ اُس رات کو آئی نہ میرے اصرار پر نہ تو میرے بیحد اصرار پر۔ اور یہ کہ پھر جلد ہی واپس چلی گئی ہے جھوٹ۔

وہ نکتہ مگر کہاں ہے۔ وہ نکتہ، زمین پر پڑے ہوئے کمبل کو پاؤں کے گرد لپیٹتے ہوئے اسد نے جھنجھلا کر سوچا، جو میرے خیال میں ایک لحظے کے لیے ابھرا تھا۔ میری یادداشت کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ ایسی باتوں کو میری یادداشت ہوا میں سے اُچک لیا کرتی تھی۔ اب معمولی چیزیں اس کے جال کو پھاڑ کر نکل جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک کتاب پڑھی تھی — اُس نے یاد کیا — کیا نام تھا اُس کا؟ وہ بھی اب یاد نہیں آ رہا۔ اس میں ایک بوڑھا آدمی اپنی زندگی کو یاد کرتا ہے۔ اپنے لڑکپن کی اُسے ایک ایک بات یاد ہے۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل، رنگ، بُو، مختلف جگہوں کے پانیوں کے ذائقے۔ پھر جوانی کی بیشتر باتیں اُس کی یاد میں تھیں۔ چار عورتوں کی رانوں کی مختلف بُو، اُن کے مُنہ کے الگ الگ مزے۔ پھر میانی عمر کی آدھ پون باتیں، اُس کے بچوں کے لڑکپن کی آوازیں، سکول کی کتابوں کے رنگ۔ پھر بچے بڑے ہو کر گھر سے چلے جاتے ہیں، بیوی اُسے چھوڑ کر جائے نماز پہ بیٹھ جاتی ہے، اور وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ پچھلے دس برس کی ایک بات بھی اُسے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ایک ایک بات کو چار چار دفعہ یاد کرتا ہے اور ہر بار اُس کی شکل الگ ہوتی ہے، وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کون سی شکل صحیح اور کون سی غلط ہے، کہ یہ بات اس طرح واقع ہوئی تھی یا اُس طرح۔ یادداشت کی بھی کیا آزاد زندگی ہے۔ جہاں یہ جوان ہوتی ہے وہاں ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ جہاں بوڑھی ہو جاتی ہے وہاں سایوں کی طرح ڈھلتی جاتی ہے، ابھی یہاں، ابھی وہاں...

مگر وہ نکتہ؟ یہ میری یادداشت ابھی بوڑھی تو نہیں ہوئی۔ اس نکتے کا کھوج ضروری ہے۔ اس سے فائدہ خواہ کچھ بھی نہ ہو، مگر ضروری ہے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ اُسی ایک لحظے میں مجھے یہ خیال بھی ہوا تھا کہ اس نکتے سے مجھے

کوئی مدد تو مل نہیں سکتی البتہ یاسمین کے بیان کی صورت واضح ہوجاتی ہے۔

یاسمین کے بیان کی صورت ہی تو اصل بات ہے، اُس نے سوچا۔

زمین پر پڑا ہوا کمبل اُٹھا کر اسد نے اپنے کندھوں پر ڈالا اور اُٹھ کر کوٹھڑی میں اِدھر سے اُدھر پھرنے لگا۔

"اُلّو کھا کر آئے ہو؟" پہریدار نے اُسے دروازے کی سلاخوں کے پاس کھڑے دیکھ کر کہا، "نہ رات کو سوتے ہو نہ دن کو۔ مر جاؤ گے۔"

اسد خاموشی سے لوٹ آیا۔ دیوار کے پاس آ کر وہ اپنے پاؤں کو زور زور سے زمین پر مارنے لگا۔ اُن کی دھمک سے کرم دین سپاہی چونک کر اُٹھا۔ اُس نے لالٹین برآمدے کی کھونٹی سے اُتاری اور دروازے کی سلاخوں کے پاس آ کر، لالٹین اُوپر اُٹھا کر اندر دیکھنے لگا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے سختی سے پوچھا۔

اسد کچھ دیر تک جواب دیے بغیر پَیر دھپ دھپ زمین پر مارتا رہا۔ "پَیر گرم کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"کمبل لپیٹ لے۔" سپاہی بولا، "نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ مر جائے گا۔"

"کمبل سے گرم نہیں ہوتے۔" اسد سلاخوں کے قریب آ کر بولا، "ایک مہربانی تو کرو۔ پیشاب والا برتن خالی کر دو۔"

"تیری ماں کی ۔ ۔ میں تیری ماں کا جمعدار ہوں؟"

"دیکھو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔" اسد نے لجاجت سے کہا۔

"مجھے تالا کھولنے کی اجازت نہیں۔ سویرے لال خان ڈیوٹی پر ہے۔ اُس سے کہنا، جمعدار سے صاف کروا دے گا۔"

"لال خاں میرے ساتھ بڑی سختی کرتا ہے۔" اسد نے کہا، "کبھی نہیں کروائے گا۔ پتا نہیں میں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے۔ تم تو خدا ترس آدمی ہو۔ دو دن ہو گئے ہیں، بُو سے سر چکرا گیا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ جاگتا رہتا ہوں تو پَیر ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔"

کرم دین کچھ دیر تک شک بھری نظروں سے اسد کو دیکھتا رہا، "بدمعاشی کرنے کی صلاح تو نہیں؟"

"نہیں۔" اسد نے دونوں ہاتھوں میں سلاخیں پکڑ کر جواب دیا، "خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔" کچھ دیر اوبے اعتمادی سے اُس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد سپاہی نے احتیاط سے پہلے دائیں پھر بائیں نظر دوڑائی، "اگر کسی کو خبر ہو گئی تو میری

بیٹی اتر جائے گی۔" وہ بولا، "مگر تمہارے اوپر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ لا یہاں رکھ دے۔" اسد جلدی سے لبالب بھرا ہوا بین کا برتن دونوں ہاتھوں میں اٹھا لایا۔ "تمہاری بڑی مہربانی۔" برتن کو دروازے کے پاس زمین پر رکھتے ہوئے وہ بولا۔

"اب پرے جا کر بیٹھ جا۔"

اسد پتھر کی طرف بڑھا تو عقب سے سپاہی بولا: "اِدھر نہیں۔ اُدھر۔ سامنے۔"

اسد سامنے والی دیوار کے پاس جا کر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔

"منہ دیوار کی طرف کر۔" کرم دین نے حکم دیا۔ اسد نے منہ دیوار کی طرف موڑ لیا۔

کرم دین اِدھر اُدھر دیکھ کر برآمدے کے کونے میں گیا اور ایک چھیتڑا اٹھا لایا۔ واپسی پر اس نے لالٹین برآمدے کی کھونٹی پر لٹکا دی۔ پھر اس نے چھیتڑے کے دو ٹکڑے کیے اور انہیں ہاتھوں پر لپیٹنے لگا۔ اچھی طرح ہاتھوں کو ڈھک کر اس نے چابیوں کا گچھا نکالا اور پھر ایک بار دائیں بائیں دیکھ کر آہستہ سے چابی تالے میں گھمائی۔ تالے کو نکال کر اس نے اس خاموشی سے کنڈا کھولا کہ بے معلوم سی آواز پیدا ہوئی۔ قیدی کی پشت پر نظریں جمائے وہ جھکا اور دونوں ہاتھوں میں برتن کو اٹھا کر سرعت سے دروازے کے باہر ہو گیا۔ برتن کو زمین پر رکھ کر اس نے اسی آہستگی سے کنڈا واپس کھسکایا اور اسے تالا لگا دیا۔ پھر اس نے برتن پکڑا اور اسے جسم سے دور اٹھائے اٹھائے برآمدے سے باہر نکل گیا۔ جب پاؤں کی چاپ دور چلی گئی تو اسد نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کرم دین کی رائفل برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ کسی طور بھی اسد کی زد میں نہ آتی تھی۔ پھر بھی اس بے پہرہ ہتھیار کو وہاں پڑے دیکھ کر اس کا دل کیا رگ اچھلا اور دھک دھک کرنے لگا۔ جب صحن سے قدموں کی چاپ پھر آئی تو وہ منہ دیوار کی طرف کر کے بیٹھ گیا۔ کرم دین نے اسی چابکدستی سے آہنی دروازہ کھولا اور برتن اندر رکھ کر اسے تالا لگا دیا۔

"لے جا۔" وہ بولا۔ جب برتن اٹھانے کے لیے اسد دروازے پر آیا تو کرم دین بولا، "کبھی اپنا بھی نجس برتن میں نے ہاتھ میں نہیں لیا۔"

"تمہاری یہ مہربانی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔" اسد نے کہا۔

کرم دین کچھ دیر تک وہیں کھڑا عجیب سی نظروں سے اسد کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا، "تم ٹٹی نہیں کرتے؟"

اسد نے پشیمان سی آواز میں جواب دیا: "نہیں۔"

"روٹی ساری کھایا کرو۔" کرم دین نے کہا، "پھانسی تو چڑھتے ہی چڑھو گے۔ حرام موت کیوں مرتے ہو۔"

جب سپاہی جا کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا تو اسد ہوا میں کمبل ہلا ہلا کر پیشاب کی بو باہر نکالنے لگا۔

رات کے کسی وقت، سر پتھر پہ رکھے، گھٹنے چھاتی سے لگائے لیٹے لیٹے وہ یکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوتی جاگتی ہوئی حالت میں اُس کے ذہن کا کوئی پھنسا ہوا پُرزہ کڑک کر کے اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گیا تھا، جیسے کوئی شہد کی مکھی جو بڑی دیر سے پھول کے ایک نقطے پر نظریں جمائے بھنبھنا رہی ہو، آخر اُس نقطے پر آہستہ سے آ کر بیٹھ جائے۔ وہ نکتہ دفعتہً اُس کی یاد کی گرفت میں آگیا تھا۔ اُس کی آدھ مچی آنکھیں کھل گئی تھیں اور نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی۔ خدایا، کس قدر خراب کیا ہے مجھے اِس ایک بات نے، اسد نے اپنے آپ سے کہا۔ یاسمین کے بیان کا بنیادی جھوٹ تو اس قدر صاف موجود ہے۔ یعنی اگر وہ میرے خلاف ہی بیان دینے پر آمادہ ہوگئی تھی تو اُس نے یہ کیوں نہ بتایا کہ مَیں بندوق مطب سے اُٹھا کر گھر میں لے گیا تھا؟ ہاں، اس بیان کی کوئی حقیقت نہیں۔ جب بھی لکھا گیا، جیسے بھی اور جہاں یہ بھی لکھا گیا غلط لکھا گیا ہے۔ بیان کی منطق میں ہی اتنا بڑا جھول ہے۔ اسد اپنی دریافت پر دل ہی دل میں خوش ہوا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو ملامت کرنی شروع کر دی۔ مَیں کیسے یاسمین کی نیت پر شبہ کر سکتا تھا؟ میرے دماغ کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنے دماغ پہ مجھے توجہ دینی چاہیے۔ اِس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو؟ وقتی طور پہ اسد کے جسم میں حرارت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یاسمین کے بیان کے بارے میں اُس کے ذہن سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا۔ وہ کمبل میں ٹانگیں پھیلا کر دیوار کے ساتھ لیٹنے لگا۔ لیٹتے لیٹتے اندھیرے میں اُس کا اندازہ کچھ غلط ہوگیا جس وجہ سے اس کا ماتھا پتھر کے کنارے سے جا ٹکرایا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تارے ٹوٹنے لگے اور اُس کا ہاتھ بے اختیار ماتھے کی طرف اُٹھا۔ ماتھا تر تھا۔ دہنی آنکھ کے اُوپر ایک ہلکا سا چیر آگیا تھا جس میں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے کمبل کا ایک کونہ زخم پر رکھا، مگر موٹے موٹے بالوں والا کھُردرا کمبل زخم کو چُبھنے لگا۔ اُس نے قمیض اُتاری اور اُسے زخم کے اُوپر دبا کر بیٹھ گیا۔ یہ اور مصیبت کیا آن پڑی، اُس نے اپنے آپ سے کہا، پہلے کیا کم تھیں۔ ہر روز رات کو یہاں لیٹتا ہوں۔ آج کیا ہوا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ اگر مَیں نے دلجمعی سے کام نہ لیا تو اسی طرح مارا جاؤں گا۔ یہ کوئی تک ہے ..... کافی دیر تک وہ قمیض کے گولے کو ماتھے پر دبائے دیوار کے ساتھ پُشت لگائے بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ کپڑے کو ہٹایا اور انگلیوں سے ٹٹول کر زخم کو محسوس کیا۔ خون بہنا بند ہو چکا تھا، مگر زخم ابھی گیلا تھا۔ قمیض بھی خون میں گیلی ہو چکی تھی۔ اسد نے اندھیرے میں قمیض کا ایک خشک حصہ تلاش کر کے نکالا اور اُسے زخم پر جما کر قمیض کو سر کے گرد دو بل دیے اور کس کر گانٹھ لگادی۔ پھر وہ آہستہ سے سر پتھر پر رکھ کر، کمبل کو اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

علی الصبح اسد نے سر پتھر سے اٹھایا تو لوہے سے بھرا ہُوا معلوم ہُوا۔ وہ اُٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ قمیض ماتھے کے زخم سے چپکی تھی اور کئی جگہ سے خُون کے خشک دھبّوں کی وجہ سے اکڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کی کاوش کے بعد وہ قمیض کی پٹی کو زخم سے جُدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس نے تھوک لگا کر زخم کے اُوپر کپڑے کو گیلا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُترتے اُترتے چپٹے ہُوئے کپڑے کی تنک سے خُون کا ایک باریک سا قطرہ زخم پر نمودار ہوگیا، جسے اسد نے قمیض سے جذب کیا۔ وہ چیر کو دیکھ نہ سکتا تھا مگر انگلیوں سے اُس نے محسوس کیا کہ تقریباً خشک ہوچکا ہے مگر بِلا نہیں، کنارے سُوج چکے ہیں اور اندر سے کچھ کچا گوشت ننگا ہوگیا ہے۔ اُس نے قمیض کا ایک خشک حصّہ تلاش کر کے اُسے زخم پر رکھا اور اُوپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے۔

دن چڑھے سپاہی لال خاں بھُورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا تو اسد کو دیکھ کر ٹھٹھکا رہ گیا۔ وہ باری باری خُون آلود قمیض، اسد کی ناک پر سُوکھے خُون کی لکیر اور پتھر پر گرے ہُوئے چند خون کے قطروں کو دیکھتا رہا۔

"یہ کیا کیا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"چوٹ آگئی ہے۔" اسد نے جواب دیا۔

"کیسے؟" لال خاں آنکھیں نکال کر بولا۔

"پتھر سے۔"

"دِکھا۔"

اسد نے زخم سے کپڑا ہٹا دیا۔ سپاہی ہاتھ میں مٹی کا پیالہ اور روٹی پکڑے پکڑے پاؤں کے بل بیٹھ کر غور سے زخم کو دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی چیزیں زمین پر رکھ دیں اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کھڑا ہو کر وہ متلاشی نظروں سے کوٹھڑی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے پاؤں سے کمبلوں کو اُٹھا کر دیکھا، پھر جا کر پیشاب کے برتن میں جھانکا، پھر زمین پر نظریں گاڑے تینوں دیواروں کے ساتھ ساتھ کوٹھڑی میں ایک چکّر لگایا۔ مزید چند لمحوں تک اسد کو شکی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چند منٹ کے بعد دروازہ ایک آہنی جھنکار کے ساتھ کھلا اور تھانیدار اندر داخل ہوا۔ اُس کے پیچھے پیچھے سپاہی لال خاں اور ایک نیا سپاہی تھا جسے پہلے اسد نے نہیں دیکھا تھا۔ قیدی پر نظریں جمائے پہلے وہ تینوں آدمی پیشاب والے برتن کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ برتن میں جھانکنے اور پیر سے ذرا سا سرکا کر دیکھنے کے بعد تھانیدار اسد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کھڑا ہو۔" اُس نے حکم دیا۔

اسد اُٹھ کھڑا ہوا۔

"پیشاب کہاں ہے؟"

اسد نے لاعلمی کے انداز میں کندھے اُچکائے۔ تھانیدار نے گھما کر ایک ڈنڈا اُس کے چوتڑوں پر مارا۔

"پیشاب کہاں ہے؟" وہ چیخا۔

"مجھے نہیں پتا۔" اسد نے چیخ کر جواب دیا، "گرا دیا ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"اندھیرا تھا۔ مجھے نہیں پتا۔ اُس طرف۔" اسد نے غیر معین سی سمت میں اشارہ کیا۔ وہ تینوں اُسی سمت میں پل پڑے۔ پہلے انہوں نے ٹارچ کی مدد سے تمام نیم روشن کونوں کھدروں میں دیکھا، پھر ایک ایک انچ زمین کا جائزہ لیا۔ بُکس کے نیچے سے اُنہیں جوار کی روٹی کے چند خشک ٹکڑے ملے۔ پھر تینوں الگ ہو گئے اور اپنی اپنی دیوار کا قریب سے بغور ملاحظہ کرنے لگے۔ نئے سپاہی کی نظر روشندان پر پڑی تو اُس نے لال خاں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب لال خاں اُس کے پاس پہنچا تو سپاہی گھوڑا بن کر کھڑا ہو گیا۔ لال خاں اُس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر چڑھا اور سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ کر، بازوؤں کے زور پر اُوپر اُٹھا۔ سلاخوں کے ساتھ مُنہ لگا کر وہ روشندان سے باہر جھانکنے لگا۔ جب ساری کوٹھڑی میں ایک بھی گیلا نشان اُنہیں نظر نہ آیا تو تھانیدار پھر اسد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"پی گئے ہو، حرامی؟" وہ چیخا۔

اسد خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

"حرام موت مرنا چاہتے ہو؟" تھانیدار نے ڈنڈے سے اُس کے پیٹ میں ٹہوکا دیا، "یہ کیا کیا ہے؟" اُس نے ڈنڈے کا سرا اسد کے ماتھے کے قریب لہرا کر پوچھا، "کیسے کیا ہے؟ کس چیز سے کیا ہے؟"

"پتھر لگا ہے۔" اسد نے کہا۔

"پتھر تجھے لگاتا ہوں، بچے۔ اپنے آپ کو زخمی کر کے بدمعاشی کرنا چاہتا ہے؟ اُتار یہ شلوار۔"

اسد دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار نے ڈنڈے سے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اسد نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر سپاہیوں نے دونوں طرف سے اُسے قابو میں کر کے اُس کی شلوار الگ کر دی۔ ایک سپاہی نے شلوار اور قمیض گول کر کے بغل میں دبا لی۔ اسد کچھ دیر تک ہاتھ لٹکائے کھڑا انہیں دیکھتا رہا، پھر کمبل اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹنے لگا۔ تھانیدار نے ڈنڈا مار کر کمبل اُس کے ہاتھ سے گرا دیا۔

"کڑی ڈال دو۔" اُس نے سپاہی سے کہا۔ لال خاں جا کر دو زنجیریں اُٹھا لایا۔ کڑک کر کے ایک ہتھکڑی اسد کے دہنے ہاتھ کو لگائی گئی، اور ایسا ہی ایک زنجیر والا کڑا اُس کے بائیں ٹخنے کے گرد ڈال کر بند کر دیا گیا۔ پھر زنجیروں کے دوسرے سروں والے کڑے دیوار میں نصب ایک تنگ اور موٹے سے کُندے میں ڈال کر "کڑک کڑک" بند کر دیے گئے۔ پتھر کی اوٹ میں زمین کے قریب، دیوار میں گڑے ہوئے اِس کُندے پہ کئی بار اسد کی نظر پڑی تھی اور اُس نے سوچا تھا کہ خبر نہیں یہ یہاں پر کیوں لگا ہے؟

اب قیدی کی تلاشی شروع ہوئی۔ لال خاں نے اُس کے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں، پھر کانوں کو کھینچ کھینچ کر اُن میں ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ "منہ کھولو۔" اسد نے منہ کھول دیا۔ زبان اُٹھوا کر، گالوں کو چٹکیوں میں بھر کر مسوڑھوں کے اندر دونوں طرف انگلی گھمائی گئی۔ اس کے بعد بازو اُٹھوا کر بغلوں کا معائنہ ہوا۔ پھر تھانیدار نے حکم دیا کہ جھک کر کھڑے ہو جاؤ۔ "یوں" اُس نے ڈنڈے کی مدد سے قیدی کے ہاتھ گھٹنوں پر جمائے۔ اُس کے چوتڑوں کے بیچ ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی اور انگلیاں گھسا گھسا کر دیکھا گیا۔ فوطوں کے گرد سختی سے تلاشی ہوئی۔ جب تلاشیوں کی تسلی ہو گئی کہ کوئی بھی تیز دھار آلہ جسم کے کسی حصے میں پوشیدہ نہیں جس سے قیدی اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تھانیدار نے پٹی کرنے کا حکم دیا۔ نیا سپاہی باہر جا کر زرد دوائی میں بھیگا ہوا روئی کا ٹرنبہ اور پٹی لے آیا۔ زرد دوائی سے سپاہی نے زخم کو صاف کیا اور اُسی روئی کو اُوپر رکھ کر پٹی باندھ دی۔ کوٹھڑی سے نکلتے نکلتے وہ پیشاب والا مٹی کا برتن بھی اُٹھا کر لے گئے۔ اُس برتن سے سخت نفرت ہونے کے باوجود اس وقت اسد کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک سہارا اُس سے چھن گیا ہو۔ چار پانچ روز میں پہلی بار اُسے پیشاب اور پاخانے کی سخت حاجت ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جب نیا سپاہی مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ لے کر آیا تو اسد کی حاجت غائب ہو چکی تھی۔ سپاہی مٹی کا برتن اُس کے قریب رکھ کر باہر چلا گیا۔ اسد کمبل اپنے اُوپر لپیٹے پتھر پہ بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ اب وہ کوٹھڑی میں کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ دو ایک بار اُس نے پورے زور سے زنجیروں کو کھینچا جس سے اُس کی کلائی اور ٹخنے میں درد ہونے لگا۔ کُنڈا اُس سے مَس نہ ہوا۔ اُس نے حساب لگایا کہ اگر زنجیریں اُس

کے دہنے ہاتھ اور دہنے پاؤں میں ہوتیں تو وہ کھڑا ہو کر اور ٹانگیں پھیلا کر سامنے والی دیوار کو ہاتھ لگا سکتا تھا مگر دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں زنجیر بند ہونے کے باعث اُس کا دائرۂ حرکت کافی محدود ہو گیا تھا۔ اگر وہ اِس پتھر کو اُٹھا سکتا، اُس نے سوچا، تو اسے کنڈے پر گرا کر زنجیریں توڑی جا سکتی تھیں۔ مگر پتھر تو آدھا زمین میں گڑا ہے۔ اب کیا کروں؟

شام سے ذرا پہلے آہنی دروازہ مانوس جھنکار کے ساتھ کھلا اور تھانیدار، ہیڈ کانسٹیبل کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ میں میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ تھانیدار نے اُس کے ہاتھ سے لے کر کپڑا کھولا اور اسد کے سامنے پھیلا دیا۔ کپڑے میں بیگن دستے والا لمبا سا چاقو تھا جس کا آدھا پھل خشک خون میں تقریباً ملفوف تھا۔ مچھلی کی شکل والے پیتل کے دستے میں سُرخ اور سبز رنگ کے متعدد چھوٹے چھوٹے چمکدار پتھر جڑے ہوئے تھے۔

"اسے پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"تیرے کمرے سے برآمد ہوا ہے۔"

"کہاں سے؟"

"تیرے سوٹ کیس سے؟" تھانیدار بولا، "کالے ٹرنک میں سے۔ کتابوں کے نیچے چھپا تھا۔ اسی طرح لپٹا ہوا۔"

"مَیں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔" اسد نے کہا۔ پھر وہ لایعنی طور پہ بولا، "ٹرنک کو تالا لگا تھا۔"

"لے۔" تھانیدار نے کپڑے کے اُوپر دھرا ہوا چاقو آگے بڑھایا، "اچھی طرح سے پہچان۔ بول۔"

"مَیں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ میرا نہیں۔"

"ایگزامنر کی رپورٹ ہے کہ یہ انسانی خون ہے۔"

"ہو گا۔" اسد نے کہا، "میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ میرے ٹرنک میں تھا۔ پتا نہیں کہاں سے لے آئے ہو۔"

"تیری ماں کی بچہ دانی سے کھینچ کر لایا ہوں۔ لے۔ یہ لے۔" اُس نے چاقو اسد کے ہاتھوں کی طرف بڑھایا، "پکڑ کے دیکھ اپنا چاقو۔"

"یہ میرا چاقو نہیں۔ تم جھوٹا چاقو مجھ پہ ٹھونس رہے ہو۔" اسد دونوں ہاتھ پُشت پہ باندھ کر دیوار سے

تک کر کھڑا ہو گیا، "میں کسی وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وکیل سے۔" تھانیدار نے طنزاً دہرایا، "کسی وکیل سے۔ اچھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کا انتظام نہ کر دوں تیرے لیے؟"

"یہ میرا حق ہے۔ تم مجھے اِس طرح یہاں نہیں رکھ سکتے۔ تم مجھ پہ تشدد کر رہے ہو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔"

"اور یہ کیا ہے؟" تھانیدار چاقو کو اسد کی آنکھوں کے آگے لہرا کر بولا، "یہ۔ یہ۔ اور جب یاسمین گل تیرے خلاف بھگتے گی تو پھر دیکھوں گا تیرا 'گواہ' کہاں گھس جاتا ہے۔"

"تو بھگتاتے کیوں نہیں؟ مجھے عدالت میں پیش کیوں نہیں کرتے؟ میں بے قصور ہوں۔ انصاف میرا حق ہے۔"

"اچھا؟ بہیمانہ مجرم اب اِنصاف کا حق مانگتے ہیں؟ آج ہی تیرے لیے انصاف کا بندوبست کرتا ہوں۔" تھانیدار سپاہیوں کی طرف دیکھ کر بولا، "تلاشی لو۔"

ایک بار پھر قیدی کی تلاشی سر کے بالوں سے شروع ہوئی۔ کانوں میں روشنی پھینکی گئی۔ منہ کھولو۔ آگے جھکو۔ بھدی کرخت انگلیاں اُس کے پوشیدہ حصوں میں گھستی اور نکلتی رہیں۔ پھر سپاہی بولا: "کوئی زخم نہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں۔"

تھانیدار نے خون آلود چاقو کو، ہاتھ لگائے بغیر، کپڑے میں لپیٹا اور ہیڈ کانسٹیبل کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ کھٹاک سے آہنی دروازہ بند ہوا اور مقفل ہو گیا۔ قیدی نے کمبل زمین سے اُٹھایا اور جسم کے گرد لپیٹ کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ زنجیروں سے ابھی وہ پوری طرح مانوس نہیں ہوا تھا، چنانچہ بار بار انہیں کھینچتا، خاص طور پہ ہتھکڑی والی کو، کبھی آہستہ، کبھی زور سے، جیسے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کئی بار اُسے خیال آیا کہ زنجیریں پڑ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے، پہلے وہ کون سا آزاد تھا، صرف اِتنا ہوا ہے کہ اُس کا دائرۂ حرکت چھ آٹھ فٹ مربع سے گھٹ کر چار فٹ مربع رہ گیا ہے۔ اگر وہ کسی طرح زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کر بھی لے تو کہاں جائے گا؟ کوٹھری میں ہی مقید رہے گا۔ اپنے آپ کو اس طرح سمجھانے کے باوجود اُس کا ہاتھ نہ تھما۔ قطعی غیر ارادی طور پر اُس کا بازو بار بار پھڑک اُٹھتا، بار بار اپنی ہڈیوں اور پٹھوں سے اُس مضبوط آہنی زنجیر کو توڑنے کے لیے زور مارتا جس کو توڑنا نہ صرف ناممکن تھا بلکہ توڑنے کا کوئی فایدہ بھی نہ تھا۔ مگر اُس کے ہاتھ کی یہ کوشش سراسر خودکار تھی، جیسے کہ اس کی تحریک، اور اس کا اشارہ اُس کے دماغ کے شعوری دائرے کے باہر سے آ رہا ہو۔ اس طرح ہاتھ کھینچتے کھینچتے وہ

تھک جاتا تو کسی لمبے خیال میں پڑ جاتا۔ آزادی کی خواہش کے طول و عرض کا شاید کوئی پیمانہ نہیں، اُس نے سوچا۔ دو فُٹ کی آزادی ہو چاہے دو میل کی۔ تھوڑی دیر کے بعد سپاہی کرم دین، جو ڈیوٹی پر آ لگا تھا، مٹی کے پیالے میں بھورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا۔ اسے قیدی کے سامنے زمین پر رکھ کر وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ اسد نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بولا :

"کھالے۔"

"میرا جی نہیں کرتا۔" اسد نے کہا، "بھوک نہیں۔"

"کھالے کھالے۔ مرجائے گا کمزوری سے۔ کسی کھڈ میں ڈال کر اُوپر پتھر پھینک دیے گئے تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہاں سے آیا کہاں گیا۔ طاقت قائم کرنے کی کوشش کر۔ اسی طرح بچے گا جب تک بچے گا۔"

"کچھ اور نہیں مل سکتا؟" اسد نے بھورے شوربے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شکر کر یہی مل رہا ہے۔ کھالے۔"

شوربے کی تلی اور بُو سے بچنے کے لیے اسد نے سانس بند کر کے جو اُسے پینا شروع کیا تو غٹا غٹ آدھا پیالہ پی گیا۔ پھر وہ روٹی کے نوالے توڑ توڑ کر، شوربے میں بھگو کر کھانے لگا۔

"میری پیشی ہوگئی تھی۔" سپاہی بولا۔

"کیوں؟"

"میرے پہرے میں تُو نے اپنا سر جو پھاڑ لیا تھا۔ اب کوئی بدمعاشی مت کرنا۔"

"اچھا۔" روٹی چباتے چباتے اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب کرم دین باہر چلا گیا تو اسد نے باقی روٹی کمبل کے نیچے چھپا دی اور شوربے کا پیالہ اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ دانتوں میں زبان پھیرتے ہوئے اُس نے سوچا، کرم دین ٹھیک کہتا ہے۔ اس وقت زندہ رہنا ہی اصل کام ہے۔ اگر طاقت ہی قائم نہ رہی تو یہاں سے کیسے نکلوں گا؟

بیٹھے بیٹھے تھک کر جب وہ لیٹنے لگا تو اُسے ایک ایسا مسئلہ درپیش ہوا جس کی طرف اُس کا خیال نہ گیا تھا؛ لیٹا کیسے جائے؟ پرانی جگہ پر لیٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جس جس جگہ اُس نے لیٹنے کی کوشش کی، کبھی ہاتھ کی زنجیر کم پڑ جاتی کبھی پاؤں کی۔ زنجیروں کے دائرے کے اندر اندر اُس نے ایک ایک جگہ پر لیٹ کر دیکھا۔ آخر سب سے آرام دہ جگہ جو اُسے ملی وہ پتھر کے دوسری طرف، دیوار سے الگ، فرش پر آڑا لیٹنے کی تھی۔ اس جگہ پر بھی اُس کی بیڑی والی ٹانگ سیدھی نہ ہوتی بلکہ صرف تین چوتھائی کھلتی۔ اب جو وہ

کمبل یہاں بچھا کر اور دُوسرا اوڑھ کر لیٹا تو اُسے عجیب سا محسوس ہونے لگا۔ کھُردرا کمبل اُس کے ننگے جسم کو ہر طرف سے چبھ رہا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کی بغلوں اور رانوں کے درمیان کوئی کپڑا نہ تھا اور اپنے ہی گوشت کا لمس اُسے اجنبی سا لگ رہا تھا۔ آخر جب ٹھنڈک اُس کے پاؤں کو چڑھنے لگی اور وُہ کمبل اوڑھے اوڑھے اُٹھ کر فرش پر کودنے لگا تو زنجیروں کی جھنکار نے رات کی خموشی میں شور برپا کر دیا۔ سپاہی کرم دین لالٹین اُٹھا کر بھاگتا ہُوا آیا اور بتی اُٹھا کر سلاخوں سے اندر جھانکنے لگا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے سختی سے پُوچھا۔

"پَیر گرم کر رہا ہُوں۔"

"تیرے مادر چود پَیر ——" سپاہی بدمزگی سے بولا، "روز ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ انہیں کمبل میں لپیٹ۔ اور شور مت کر، ورنہ اندر آ کر پتھر سے باندھ دوں گا۔ پھر پیشی کروائے گا؟ بیٹھ جا۔"

اسد نے پتھر پر بیٹھ کر پہلے اپنے آزاد پَیر کو اُٹھا اُٹھا کر زمین پر مارا، اور جب وہ کچھ گرم ہو گیا تو اُسے کمبل میں لپیٹ لیا۔ پھر دُوسرے پاؤں کی زنجیر کو آزاد ہاتھ سے تھام کر پَیر زمین پر مارنے لگا۔ اس سے زنجیر کے بجنے کی آواز قدرے رُک گئی۔ ٹھنڈک اب اُس کے ننگے بدن میں سرایت کرتی جا رہی تھی اور جلد پر رونگٹے سر اُٹھا رہے تھے۔ اُس نے زمین پر بچھا ہُوا کمبل اُٹھا کر اُوپر والے کمبل سے جوڑا اور اُن میں لپیٹ لپٹا کر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔

آدھی رات کے وقت پہرہ بدل گیا۔ نیا سپاہی جو پہرے پر آیا اُس نے ایک نئی حرکت شروع کر دی۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ لالٹین کھونٹی سے اُتارتا، دروازے کے پاس آ کر قیدی کو دیکھتا، پھر اپنی رائفل کا دستہ سلاخوں کے درمیان ڈال کر اُسے زور زور سے سلاخوں پر بجاتا، جیسے سکول کی گھنٹی بجا رہا ہو، اور ایک آدھے منٹ تک بجائے جاتا۔ پھر مُنہ سے کچھ بولے بغیر واپس جا کر لالٹین ٹانگ دیتا اور برآمدے میں پھرنے لگتا۔ قیدی ہر آدھ گھنٹے کے بعد، کبھی اونگھتا ہُوا کبھی وا آنکھوں کے ساتھ، اس شور سے چونک کر اُٹھ بیٹھتا۔ پَو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے پہریدار نے سلاخیں بجانے کا سلسلہ بند کر دیا۔ اُس وقت اسد نے کچھ نیند کی۔ دو گھنٹے کی نیند میں بھی اُس کا بازو وقفے وقفے پر زنجیر کو چھوٹے چھوٹے، خودکار جھٹکے مارتا رہا۔

★ ★ ★ ★ ★